اوم

بھولا ناتھ

از قلم

شری رابندر ناتھ ٹیگور

پبلشرز

بھارت اسٹاک بھنڈار کٹڑہ آہلووالیہ امرتسر

قیمت ... ۱۲ ...

تاریخ ۱۹۳۳

فہرست مضامین

بھولا ناتھ

وہ لوگ جو یہ بات کہتے ہیں کہ جب کمل ناتھ بستر مرگ پر تھا۔ تو انکی دوسری بیوی مکان کے اندر اپنے کمرے میں بیٹھی ہوئی تاش کھیلنے میں مشغول تھی۔ وہ سب لوگ تمام دنیا کی مذمت کرنا ہی کارِ نیک سمجھتے ہیں رائی کا پہاڑ اور سوئی کا بھالا بنا دینے میں ان کو کمال حاصل ہے وہ اصل بات یہ ہے کہ اس وقت پاؤں رکھے یکسوئی قلب کیساتھ وہ ہری مرچیں اور مولی کے ساتھ نمک اور گھی میں تلے بھنے چنے چبا رہی تھی۔ اتنے میں اس کو آواز پڑی۔ چنوں سے خالی برتن کو آگے سے ہٹاتی ہوئی وہ ذرا تن بگڑ کر بولی "آگ لگے ایسی رفاقت ہیں، دو چنے منہ ڈالنے کی فرصت بھی نصیب نہیں ہوتی۔ جب دیکھو یہی گڑبڑ"

ادھر جب ڈاکٹر صاحب ناامیدی کے پر تاسف لہجہ میں ٹکا سا جواب دیکر چلے گئے۔ تو کمل ناتھ کے چھوٹے بھائی بھولا ناتھ نے آہستہ سے کہا۔ دادا۔ اگر آپ وصیت نامہ تحریر کرانا چاہیں

ہیں۔ تو حکم کیجئے۔ کمل ناتھ نے ٹوٹتی ہوئی آواز میں کہا میں بولتا ہوں۔ تم لکھو۔ بھولا ناتھ قلم دوات لیکر لکھنے کے لئے آمادہ ہوئے کمل ناتھ نے کہا میں روپیہ پیسہ اور زمین مکان وغیرہ اپنی تمام جایداد کو اپنی بیوی مالتی کے نام منتقل کرتا ہوں۔ بھولا ناتھ نے یہ سب کچھ تحریر کر دیا لیکن دوران تحریر میں ان کے دل کے ساتھ ہی ہاتھوں کی انگلیوں میں گرفتار قلم بھی کئی مرتبہ ہل گئی۔

بھولا ناتھ کو یقین کامل تھا۔ کہ اس کے بڑے بھائی کمل ناتھ اپنی تمام جایداد اپنے بھتیجے رام ناتھ کے نام منتقل کر جائیں گے کیونکہ وہ لاولد تھے۔ بیشک کمل ناتھ اور بھولا ناتھ دونوں کا کھانا جدا جدا تیار ہوتا تھا۔ پھر بھی اس امید کامل سے رام ناتھ کی والدہ نے اپنے بیٹے کو ملازمت نہ کرنے دی۔ اس نے نہایت عجلت سے رام ناتھ کی شادی بھی کر دی۔ اور دشمنوں کی آنکھوں میں رائی نمک کے تیز مصالحہ دار کھٹکنے والے کانٹے ڈالدئے۔ رام ناتھ کی شادی بیکار بھی نہیں گئی۔ رام ناتھ ایک بیٹے کا باپ بن چکا تھا لیکن پھر بھی بھولا ناتھ نے وہی کچھ تحریر کیا۔ جو اس کے بڑے بھائی نے کہا۔ اور وصیت نامہ تحریر کر دینے کے بعد اس نے بستر مرگ پر پڑے ہوئے کمل ناتھ کے دست ناتواں میں قلم دیدی۔ تاکہ وصیت نامہ پر اس کے دستخط ثبت ہو جائیں۔ کمل ناتھ نے دستخط کر دئیے۔ چند ایک دیر کی [illegible]

کھینچ ڈالیں انہیں دیکھ کر یہ بتانا بہت مشکل تھا۔ کہ یہ دستخط کس شخص کے ہیں؟

چنوں کے چبانے کے بعد جس وقت کمل ناتھ کی بیوی مالتی وہاں آئی اس وقت مریض کی قوت گویائی کلمہ تمام شد پڑھ چکی تھی ایسا دیکھ کر مالتی رونے لگی پیشتر ہی سے بیشمار لقینی خیالات کے ہوائی قلعے باندھنے والوں کو موقعہ پڑنے پر کمل ناتھ کی جائیداد سے ایک پھوٹی کوڑی بھی نصیب نہ ہوئی۔ تو وہ کہنے لگے۔ ابھی مالتی کا یہ رونا دھونا سب ڈھونگ ہے لیکن انکی طرف سے کہی ہوئی اس بات پر یقین کرنے کو ہمارا اپنا دل نہیں مانتا۔

وصیت نامے کے بارے میں سن کر رام ناتھ کی والدہ اس جگہ بھاگتی ہوئی آئی۔ اور آتے ہی اس چلا چلا کر شور مچانا شروع کر دیا۔ مرتے وقت انسان کی عقل میں فتور پڑ جاتا ہے۔ اپنے بھتیجے کے ہوتے ہوئے ....!

بھولا ناتھ کو اگرچہ اپنی بیوی سے بہت عقیدت تھی۔ اس قدر بڑھی چڑھی عقیدت تھی۔ کہ ہم اسے خوف بھی کہہ سکتے ہیں لیکن پھر بھی اس سے نہ رہا گیا۔ وہ دوڑ کر آئے اور بولے .... راموں کی ماں تم ابھی با عقل اور سیانی نہیں ہو پھر یہ کیا پاگل پن گھول رہی ہو۔ دادا چلے گئے لیکن میں تو موجود ہوں۔ جو کچھ کہنا ہو۔ مجھے تنہائی میں کہنا یہ منا سب وقت نہیں ہے۔

دوسری طرف مرحوم چچا کے بھتیجا صاحب یار دوستوں کی بزم محبت میں بیٹھے ہوئے طبلہ بجا رہے تھے۔ چچا کی بیماری کے متجاوز کرنے کی خبر دو تین گھنٹے پیشتر سے بار کبھی حضرت طبلے کی نئی گت بجانے میں مشغول رہے اور مکان پر اسوقت پہنچے جبکہ چچا صاحب فانی دہر سے داغ مفارقت دیکر عدم آباد کیطرف روانہ ہو چکے تھے۔

حضرت کو یہ بات دروازے پر آتے ہی معلوم ہو گئی۔ کہ وصیت نامہ تحریر ہو چکا ہے۔ جس کی رو سے اُسے جائیداد میں سے ایک پھوٹی کوڑی بھی نصیب نہیں ہوتی۔ گھر میں آتے ہی مردے کو ڈانٹ کر کہا۔ دیکھ لونگا تمہیں کون آگ دیتا ہے۔ شرادھ کون کرتا ہے؟ میں تو کچھ بھی نہ کروں گا۔

لیکن کمل ناتھ اپنی زندگانی میں بھی ان باتوں کو ایک لمحہ کے لئے تسلیم نہ کرتے تھے۔ اس کی وجہ یہ تھی۔ کہ وہ بہت عرصہ تک کلکتے جیسے بڑے شہر میں مسٹر ڈف صاحب نامی انگریز کی چھاپہ خانہ کے جلیل القدر عہدہ پر فائز رہ چکے تھے۔ اور ہندو مذہب کے شاستر میں جو اشیاء خلاف مذہب اور ممنوع کہیں۔ وہ ان کو خاص طور پر جی جان سے نوش فرماتے تھے۔ لیکن اگر انہیں کوئی عیسائی کا خطاب دیتا۔ تو وہ فرماتے تھے۔ ہرے ہرے اگر میں عیسائی ہوؤں تو گوشت کھاؤں۔ زندگانی میں جس کا

یہ حال ٹھا کہ اس کے مرنے کے بعد برہمن لوگوں کو بھوجن کھلانے کے ڈر سے تین میں آگ دینے کی دھمکی سے خوفزدہ کرنا ممکن نہیں بات تھی۔

لیکن اس وقت موت کی دائمی آغوش میں آرام سے پڑے ہوئے چچا سے اس طرح کا انتقام لینے کے سوا اور کیا دھرا تھا رام ناتھ کو یہ سوچ کر کچھ خوشی ہوئی۔ کہ اس کا چچا دوسری دنیا میں جا کر فاقوں مرے گا۔ اس نے اپنے دل میں یہ خیال کیا کہ میں اپنے چچا کی جائداد سے محروم ہو کر بھی نہ کسی طرح سے تو اپنی شکم پروری کر لونگا لیکن چچا صاحب جس دنیا میں گئے ہیں۔ وہاں تو بھیک بھی نہیں ملتی... بچہ جی کو تب نانی یاد آ جائے گی۔

بھولا ناتھ نے اپنی بیوہ بھاوج کے قریب جا کر کہا۔

" بھابی دادا تمہیں اپنی تمام جائداد دے گئے ہیں۔ یہ لو وصیت نامہ اسے سنبھال کر رکھنا۔ یہ بہت ضروری ہے۔

اس وقت بھولا ناتھ کی بیوہ بھاوج اونچی آواز میں لمبے لمبے الفاظ کہہ کر نالہ و فغاں میں مصروف تھی۔ اس کی رفاقت میں محلہ کی دو چار عورتیں بھی شامل ہو کر نہایت ترنم سے نغمہ تاسف گاتی ہوئیں گاؤں والوں کی میٹھی نیند میں رخنہ ڈال رہی تھیں۔ اس درمیان میں وصیت نامہ کے کاغذ نے وہاں پہنچ کر بیوہ مالتی کو نغمہ تاسف کی ترنم سے جدا کر دیا۔ اور

اس کا چہرہ بھی خیال نا سعف آئینہ دار نہیں رہا۔ اس طرف نالہ و فغاں نے ایک اور طرح کی صورت اختیار کر لی۔

"ارے رام اے ! میں تو لٹ گئی ۔ میرا تو سب کچھ تباہ ہو گیا اچھا بھولا یہ وصیت نامہ کس نے تحریر کیا ہے کیا تم نے لکھا ہے ! ارے رام اے ! اب مجھے اس طرح کون پیار کریگا ؟ (عورتوں سے) ارے ذرا دم تو لو مٹیوا کی اماں ! بات تو سننے دے ہائے رے میں ہی کیوں نہ پہلے مر گئی ۔ میں کیوں جیتی رہی ۔

ایک لمبا سانس لے کر بھولا ناتھ نے اپنے دل ہی دل میں کہا ۔

ہم لوگوں کی بدقسمتی سے ...."

جب بھولا ناتھ اپنے گھر میں داخل ہوا تب رام ناتھ کی ماں اس کے پیچھے ہاتھ دھو کر پڑ گئی جس طرح کہ بھرے ہوئے چھکڑے کو لیکر گڑھے میں گرا ہوا بدنصیب بیل کوچوان کی ہزاروں چوٹیں اور گالیاں کھا کر بھی کوئی علاج نہ ہونے کے باعث اس جگہ چپکے سے کھڑا رہتا ہے اس طرح بھولا ناتھ بھی بہت دیر تک خاموش کھڑے سنتے اور برداشت کرتے رہے آخرش دقت بھری آواز میں بھولا ناتھ نے کہا ۔ اس میں میری لگاوٹ ہی کیا ہے ۔ میں داتا تو نہیں ہوں ۔ پھر مجھ سے کیوں بگڑ رہی ہو؟ رام ناتھ کی ماں ناگن کی طرح پھنکارتی ہوئی کھڑی ہو گئی

اور بولی۔ ماہواریں تمہاری کیا لگاوٹ ہے۔ تم تو بڑے شریف صورت ہو۔ دادا نے کہا لکھو اور تم نے لکھ ڈالا۔ تم سب ایک ہی تھیلی کے چٹے بٹے ہو۔ تم بھی تو مرتے وقت ایسا کر جاؤ گے میرے مرتے ہی کسی ڈائن سے شادی کرو گے اور اسی کے نام سب کچھ تحریر کر کے میرے رام ناتھ کو کنگال بنا دو گے۔ لیکن ایسا تو نہیں ہو سکتا ہے میں جلدی نہ مروں گی۔

اس طرح سے بھولا ناتھ کے الٰہی قہر پر تنقید کرتے ہوئے اس کی بیوی کی گرج اور بھی زیادہ بڑھنے لگی۔ بھولا ناتھ کو اس بات کا پورا علم تھا۔ کہ اگر وہ اپنی بیوی کی تقریر کے دوران میں دخل در معقولات کی کوشش کریں گے تو نیکی کے عوض برائی پیش آئے گی۔ اسی خوف کے مارے وہ مجرم کی مانند دبکے کی مانند دبکے ہوئے گُتے کی طرح خاموش رہے گویا جنہوں نے تمام کام ختم کر چکے ہوں۔ گویا جس طرح رام ناتھ کو اپنی جائیداد میں سے ایک پھوٹی کوڑی تک نہ دیتے ہوئے اپنی دوسری بیوی کے نام سب کچھ تحریر کر کے مر چکے ہوں۔

اب تو جرم کو تسلیم کر لینے کے سوا اور کوئی چارہ نہ تھا۔ شامت اعمال اور اس پر بیوی کی عقیدت زن مرید کا منہ بولتا نمونہ۔ بابو بھولا ناتھ جو تھے۔

اُسی دوران میں رام ناتھ نے اپنے سمجھدار دوستوں کے

مشورہ سے اپنی ماں کو آکر کہا۔ بس اب کسی قسم کے فکر کی بات نہیں ہے۔ یہ تمام جائیداد مجھے ہی ملیگی لیکن چند روز کے لئے باؤجی کو ادھر اُدھر کر دینا بہت ضروری ہے۔ ان کے اس جگہ رہنے سے تمام معاملہ بگڑ جائیگا۔ رام ناتھ کی ماں کو اپنے خاوند کی بیوقوفی کے بارے میں کچھ بھی شبہ نہ تھا۔ اس کو بھی رام ناتھ کی یہ رائے پسند آگئی۔ ایک اور دو مل کر گیارہ ہو جاتے ہیں آخرش رام ناتھ کی ماں نے ایسا رنگ جمایا۔ کہ لاچار ہو کر بیوقوف بھولا ناتھ کو کچھ عرصہ کیلئے گھر چھوڑ دینا پڑا اور اس نے بنارس میں جا کر ایک دوکاندار کی ملازمت اختیار کر لی۔

بھولا ناتھ کے جاتے ہی رام ناتھ اور مالتی نے مقابلاً ایک دوسرے کے خلاف جعلی وصیت نامہ تیار کرنے کا مقدمہ دائر کر دیا۔ رام ناتھ نے عدالت میں اپنے نام کا وصیت نامہ پیش کیا۔ جس کی رُو سے کمل ناتھ کی تمام وراثت اس کیلئے تھی۔ اور نیچے کمل ناتھ کے صاف طور پر دستخط موجود تھے اس کے علاوہ اس کی تحریری تکمیل کیلئے دو تین معزز گواہ بھی مل چکے تھے۔ مالتی کے گواہ تو صرف بھولا ناتھ ہیں اور یہ وصیت نامہ جو دستخط ثبت ہیں۔ وہ بھی صاف طور پر تحریر نہیں ہیں۔ مالتی کے گھر میں اس کا ایک ماموں زاد بھائی قیام کرتا تھا۔ اس نے کہا دیدی (بڑی بہن) تم فکر مت کرو۔

میں خود شہادت دونگا۔ اور دوسرے گواہوں کو بھی جمع کر دونگا
جب یہ تمام معاملہ بخوبی طور پر سرگرم سا ہو گیا۔ تب رام ناتھ کی ماں نے اپنے خاوند میاں بھولا ناتھ کے نام تار ارسال کیا کہ بستر مرگ پر کوئی دم کی مہمان ہوں۔ ایک نظر چاہو تو دیکھ لو"
تار ملتے ہی بھولا ناتھ سادہ لوح حضرت بیوی کی آخری ملاقات کی امید کو دل میں لئے ہوئے گھر پہنچے معلوم نہیں کہ گھر میں گھر والی کو بستر مرگ کی بجائے اونچی سی چٹائی پر بیٹھے ہوئے تلے بھنے چنے چباتے دیکھ کر بھولا ناتھ کو تعجب ہوا۔ یا خوف.... عجیب کمپرسی کی حالت تھی۔
جس وقت بھولا ناتھ گھر میں آئے اسی وقت اتفاقاً عدالت کی طرف سے اس کے نام شہادت کے لئے ایک بلاوا آیا ہے اور اس وقت جبکہ وہ اس عدالتی بلاوے کے کاغذ "سمن" کو الٹ پلٹ کرکے بغور دیکھنے میں مشغول تھے اور دل میں عجیب حیرت کیساتھ یہ سوچ رہے تھے اسی وقت رام ناتھ کی ماں نے اس جگہ آکر رونا پیٹنا شروع کر دیا۔ اور کہنے لگی۔
وہ ڈائن تو میرے بچے کے چچا کی جائیداد کو ہڑپ کرنا چاہتی ہی ہے۔ اور اسی کیساتھ ہی وہ کالے منہ والی میرے بچے کو جیل بھجوانے کی تیاری میں مصروف ہے وغیرہ وغیرہ
آخر خوش اندازے سے تمام معاملہ سمجھ لینے کے بعد بھولا ناتھ

ضبط الکلم ایسے رہ گئے۔ انہوں نے چلا کر کہا تم نے یہ کیا ظلم ڈھایا ہے آہستہ آہستہ اپنا اصلی رنگ اختیار کر کے گھر والی نے جواب دیا کیوں اس میں رام ناتھ کا کونسا قصور ہے۔ کیا وہ اپنے چچا کی جائیداد چھوڑ دے۔

وہ کونسا خاندانی چشم و چراغ بھتیجا ہے جو یہ برداشت کر سکتا ہو۔ کہ نہ جانے کہاں سے آئی ہوئی خاوند کو ہڑپ کر جانیوالی ڈائن چچا کی دولت پر قبضہ کرے اور وہ منہ دیکھتا رہے؟ اگر بستر مرگ پر کسی بد روح کے چھایا سے بوڑھے چچا کی عقل ماری گئی ہو تو اس کے اس غلط خیال اصلاح کیا بھتیجا نہیں کر سکتا؟ کیا یہ بھی کوئی بے انصافی ہے۔

چکر میں چکر کھائے ہوئے بھولا ناتھ نے جب دیکھا کہ عورت بیوی اور بیٹا کبھی شور و شر اور کبھی کبھی متانت و سنجیدگی دکھا رہے ہیں تب وہ پیشانی کو تاسف کی چوٹ دیتے ہوئے خاموش ہو گئے۔ انہوں نے کھایا غرضیکہ پانی تک نہیں پیا۔

اسی طرح بھوکے پیاسے رہ کر دو دن گذار دیئے۔ مقدمے کی پیشی کا دور آیا۔ اسی عرصہ کے دوران میں رام ناتھ نے مالتی کے ماموں زاد بھائی کو خوف اور لالچ دیکر اس طرح سے قابو میں کر لیا تھا۔ کہ مجبور ہو کر اس نے رام ناتھ کے اشارے پر شہادت دی۔ مالتی کی شکست اور رام ناتھ کی جیت میں کوئی بھی شُبہ نہ تھا۔

باقی نہ رہا۔ لیکن اسی وقت عدالت کے چپراسی نے بھولا ناتھ کے نام کی ہانک لگائی۔

بھوک اور پیاس کی دو روزہ شدت سے نیم جان ہو چکے بھولا ناتھ کانپتے ہوئے ہاتھوں کی گرفت سے عدالت کا کٹہرا پکڑ کر شہادت کیلئے کھڑے ہوئے اس کی زبان اور ہونٹ خشک سے ہو رہے تھے۔ ہوشیار بیرسٹر نے بڑی قابلیت سے اصل بات کہلوانے کیلئے جرح کرنی شروع کی۔ بیرسٹر صاحب بہت دور سے شروع کر کے نہایت ہوشیاری کیساتھ کمال حوصلہ کے انداز سے تذکرے کے نزدیکی پہلو پر آنے کی کوشش کرنے لگے۔

تب بھولا ناتھ نے جج کی طرف مخاطب ہو کر ہاتھ جوڑ کر اور کہا "حضور میں بوڑھا اور بہت ہی کمزور ہوں۔ مجھ میں زیادہ بولنے کی قوت بھی نہیں ہے۔ مجھے جو کچھ کہنا ہے۔ اسے میں مختصر طور پر بیان کئے دیتا ہوں مرحوم میرے بڑے بھائی کمل ناتھ تھے۔ وہ بستر مرگ پر وصیت نامہ تحریر کرا کے اپنی تمام وراثت اپنی بیوی مالتی کو دے گئے ہیں میں نے وصیت نامہ کو خود اپنے ہاتھوں سے تحریر کیا تھا۔ اور بھائی صاحب نے اپنے ہاتھوں سے اس پر دستخط کئے تھے میرے لڑکے رام ناتھ نے جو وصیت نامہ عدالت میں داخل کیا ہے وہ جعلی ہے"۔

اس قدر کہنے کے بعد بھولا ناتھ حالت نزاع میں گر پڑے اور ان پر غشی طاری ہو گئی۔

چالاک بیرسٹر نے اپنے قریب کھڑے ایک وکیل کو مذاقیہ انداز میں کہا "کیوں کس طرح سے تسلیم کرایا۔ دیکھا؟"
مالتی کے ماموں زاد بھائی نے پالکی میں بیٹھی ہوئی اپنی بہن سے کہا "بوڑھے بھولا ناتھ نے تو سب کچھ خاک کر دیا تھا لیکن میری شہادت سے تمہارا مقدمہ سنبھل گیا!"
مالتی نے جواب دیا "ہاں کسی کے دل کی بات کون جان سکتا ہے! میں تو بوڑھے کو بھلا انسان سمجھتی تھی۔"
جیل خانہ کی سلاخوں کے پیچھے بند رام ناتھ کے دوستوں نے مل کر باہمی طور پر یہ فیصلہ کیا کہ بوڑھے نے مارے خوف کے ایسا کام کیا ہے۔ شہادت کے کمرے میں جا کر وہ گھبرا سا گیا اس طرح کا بیوقوف انسان تو تمام شہر میں تلاش کرنے سے بھی نہیں مل سکتا۔"

عدالت سے لوٹ کر جب بھولا ناتھ گھر پہنچے۔ تو ان کو بخار سا ہو گیا جس نے سرسام کی شدید حالت اختیار کر لی۔ آخری ایام میں بیٹے کے نام کی رٹ لگاتا ہوا وہ بیوقوف تمام گھر کو اگاڑنے والا رام ناتھ کا دشمن باپ زمین پر سے اٹھ گیا! لیکن دوستوں میں کسی کسی دوست نے تو اس قدر

ضرور کہتا کہ اگر چار روز پیشتر ہی مر جاتا تو کیا ہی اچھا ہوتا

سہ قسمت کی خوبی دیکھئے ٹوٹی کہاں کمند
دو چار ہاتھ جب کہ لب بام رہ گیا

بھوت

بھادوں کا مہینہ تھا۔ شام ہو چکی تھی۔ چڑامن چکرورتی اندرونی دالان کے برآمدہ میں چٹائی پر بیٹھے حقہ پی رہے تھے دالان میں ان کے بڑے بھائی بستر پر پڑے تھے۔ ان کو بخار چڑھ رہا تھا۔ اس لئے ڈاکٹر صاحب کی تشریف آوری کا انتظار تھا۔

چڑامن اور چندر کانت دونوں سگے۔ یہ گوہاٹی کے قریب موضع چندر دیو پور میں رہتے تھے۔ ان کا گھرانہ نہ بہت امیر تھا۔ اور نہ بہت غریب لیکن افواہ یہ تھی کہ بڈھے چندر کانت کے پاس اس وقت دس ہزار روپیہ نقد موجود ہے۔ کوئی کہتا تھا کہ یہ بات جھوٹ ہے کوئی کہتا تھا۔

سچ ہے لیکن پھر بھی کسی نے آج تک یہ روپیہ اپنی آنکھ سے نہ دیکھا تھا۔ یہ صندوق بوڑھے کے سونے کے کمرے میں رکھا رہتا تھا۔ بوڑھا اس صندوق کو ہمیشہ اپنی نظروں کے سامنے رکھتا تھا۔ اس کا لڑکا نوکمار صوبجات متحدہ میں کہیں ملازم تھا۔ اُس نے کئی بار چاہا۔ کہ اپنے بزرگ باپ کو وہاں لے جائے لیکن بوڑھا چندر کانت جانے پر رضامند نہ ہوا تھا۔

اس لئے عام خیال یہ تھا۔ کہ وہ صندوق کو چھوڑ کر کہیں جانا پسند نہیں کرتا۔

چھڑامن خاموش بیٹھا حقہ پی رہا تھا۔ کہ اتنے میں لالٹین کی روشنی صحن میں پڑی۔ اور ڈاکٹر صاحب نے دہلیز میں کھڑے ہو کر پوچھا۔

" چکرورتی جی کیا حال ہے؟

" چکرورتی نے حقہ نیچے رکھ کر کہا۔

" ڈاکٹر صاحب آیئے تشریف لایئے۔ آپ کی عنایت سے اچھا حال ہے ابھی کچھ کچھ بیہوشی ہے۔ بخار بھی کسیقدر تیز ہے لیکن نبض کی حالت اچھی ہے اوپر تشریف لاکر ذرا ایکبار اپنی آنکھ سے دیکھ جایئے۔

چھڑامن ڈاکٹر صاحب کو دروازہ کھول کر دالان کے

اندر لے گیا۔ بیمار کے بستر کے قریب ایک مٹی کا چراغ ٹمٹما رہا تھا۔ ایک لمبے چوڑے تخت پر ایک میلا کچیلا گدا بچھا تھا اور اس پر بیمار پڑا تھا۔ اس کے لڑکے کی بہو ساوتری لپسی ہوئی ہلدی اس کے تلوؤں سے مل رہی تھی۔ ان لوگوں کو گھر میں آتے دیکھ کر ساوتری نے گھونگھٹ کھینچ لیا چوڑامن چکرورتی نے چراغ کچھ زیادہ روشن کر دیا۔ ڈاکٹر صاحب نے بوڑھے چندر کانت کی نبض دیکھی پھر ماپٹر لگا کر بخار کی حالت معلوم کی۔ پھر بیمار کی اچھی طرح دیکھ بھال کر کے کہا۔

"اب بھی بخار بہت تیز ہے فیوور مکسچر دیا جاتا ہے۔ یا نہیں؟"

ساوتری نے سر ہلا کر بتلایا۔

"دیا جاتا ہے"

ڈاکٹر نے کہا۔

"آج تمام رات دوا دیتی رہو۔ پرمیشور کی کرپا سے صبح تک بخار اتر جائے گا"

یہ کہہ کر ڈاکٹر صاحب باہر آئے۔ چوڑامن بھی ان کے پیچھے پیچھے آ گئے۔

ڈاکٹر صاحب نے پوچھا"

" تو تمہارے بابو کو بیماری کی خبر دی گئی ہے؟
چوڑامن نے جواب دیا۔
نہیں! نہیں دی گئی ہے۔ تاہم کوئی فکر کی بات نہیں
بھائی صاحب اچھے ہو جائیں گے۔ اکثر ان کا ایسا
ہی حال ہو جاتا ہے۔ مگر پھر آرام ہو جاتا ہے۔ بابو کو خبر دی
تو وہ گھبرا کر یہاں بھاگا آئے گا۔ جانے میں بہت سا روپیہ
خرچ ہو گا۔ اس لئے خبر نہیں دی گئی "
ڈاکٹر صاحب نے جواب دیا۔
" اس مرتبہ ان کا جانبر ہونا کچھ مشکل ہی نظر آتا ہے۔
آج پانچ دن سے بخار یکساں بنا ہوا ہے۔ کمزوری حد
سے زیادہ بڑھ گئی ہے۔ بخار اترنے وقت اگر بچ جائیں تو
بڑی بات ہے "

" نہیں نہیں میں ان کی عادت سے اچھی طرح واقف
ہوں۔ ابھی انہیں کچھ نہ ہو گا۔ آپ کی دوا سے جلد اچھے ہو
جائیں گے "
چوڑامن نے کہا۔
مگر ڈاکٹر نے پھر بھی یہی کہا
" بہت سن رسیدہ ہیں۔ اسی لئے خطرہ ہے۔ ورنہ اور
تو کوئی ڈر کی بات نہیں "

یہ کہہ کر ڈاکٹر صاحب چلے گئے۔"

(۲)

ڈاکٹر ہی کی بات سچ ہوئی۔ صبح ہوتے ہوتے بوڑھے چندر کانت نے دم توڑ دیا۔ مرنے کے وقت اُسے ایک منٹ کے لئے ہوش آیا تو اُس نے صرف اتنا کہا۔

"نوبو آیا ہے یا نہیں"

گھر میں کہرام مچ گیا۔ پڑوس کے لوگ رونے کی آواز سُن کر جمع ہو گئے۔ سب آدمی حسب دستور اطمینان اور دلاسے کی باتیں کہنے لگے۔ کوئی بولا۔

"بہت اچھا ہوا۔ ان کی جان خاتمہ پر آ گئی تھی۔ کچھ بہت تکلیف نہیں اُٹھانی پڑی۔

کسی نے چوڑامن کو تسلی دیتے ہوئے کہا۔

"تم لوگوں کے لئے سب کچھ چھوڑ گئے ہیں۔ انہوں نے اپنی عمر میں سب حوصلے پورے کر لئے۔ تمہارے سامنے ان کا چولا بدل گیا۔ یہ اُن کی خوش نصیبی ہے۔"

کسی نے کہا۔

"مگر افسوس یہ ہے کہ مرتے وقت نوبو اُن کے پاس نہ تھا۔ اگر اس وقت نوبو آ گیا ہوتا تو وہ تو اُسے اپنی آنکھوں سے ایک

بار دیکھ لیتے۔

مرحوم کی آخری رسوم ادا کرنے کی تیاریاں ہونے لگیں۔ ستیانند تو کمار کا لنگوٹیا یار تھا۔ چوڑامن نے اس کا ہاتھ پکڑ کر کہا۔

"بابو تم نوبو کو ایک تار بھیج دو۔ رنج و افسوس کی وجہ سے اس وقت میرے ہاتھ پاؤں کچھ کام نہیں کرتے"۔ ستیانند نے کہا۔

"اچھا دفتر جاتے ہوئے سٹیشن سے تار بھیج دوں گا"۔ ستیانند کلکتہ میں ملازم تھا۔ اور ہر روز نو بجے صبح کی گاڑی سے دفتر جایا کرتا تھا۔ وہ سارا دن اظہار افسوس اور عیادت داری میں گذر گیا۔ شام ہوتے پر سب لوگ صرف دودھ پی کر سو رہے۔

چچا چوڑامن کی بیوی مدت ہوئی رحلت کر گئی تھی۔ وہ اکیلے ایک کوٹھڑی میں سوتے تھے۔ آہستہ آہستہ رات زیادہ گذر گئی۔ ہر طرف خاموشی پھیل گئی۔ کہیں کوئی آواز سنائی نہ دیتی تھی۔ سب لوگ خواب غفلت میں پڑے تھے۔ صرف چوڑامن چارپائی پر لیٹے ہوئے کروٹیں بدل رہے تھے معلوم ہوتا تھا سب سے زیادہ رنج انہیں کو ہوا تھا۔ افسوس بھی تھا یا نہیں۔ یہ تو کہا نہیں جا سکتا۔ کیونکہ تقریباً ہم عمر بوڑھوں

میں سے ایک کے مرنے پر دوسرے کو یہ خوف پیدا ہو جاتا ہے کہ اب میری باری آنے والی ہے کچھ دن گذرنے پر میری بھی یہی حالت ہو گی۔

آدھی رات گذر جانے پر چوڑامن اپنی چارپائی سے آہستہ آہستہ اُٹھے۔ اور اندھیرے میں ٹٹولتے ہوئے اپنی کوٹھڑی کا دروازہ کھول کر باہر آ کر کھڑے ہوئے ایک تو اندھیری رات دوسرے آسمان پر بادل چھائے ہوئے تھے۔ اس لئے ہر طرف غیر معمولی تاریکی پھیل رہی تھی۔ ہاتھ کو ہاتھ سوجھائی نہ دیتا تھا۔ اتنے میں باہر جنگل کی طرف ایک گیدڑ بول اُٹھا تھا۔ چوڑامن کا کلیجہ دھک سے رہ گیا۔ مگر جلدی سنبھل گئے بُت بنے چُپ چاپ ایک طرف کو کھڑے ہو گئے۔ بعد ازاں پاؤں کی آہٹ بچاتے ہوئے آہستہ آہستہ دالان کی طرف بڑھے جس کمرے میں اُن کے بڑے بھائی رہتے تھے۔ اور جہاں انکی موت واقع ہوئی تھی اس کمرے میں آج تالا پڑا ہوا تھا چوڑامن نے آہستہ سے تالا کھولا۔ خوف سے ان کا کلیجہ کانپ اُٹھا۔ چھاتی دھڑکنے لگی ..... ہائے بھائی کی محبت کیسی ہوتی ہے۔

چوڑامن پیکر ورتی نے بڑی آہستگی سے دروازہ بند کر کے دیا سلائی سے چراغ روشن کیا۔ لوہے کے صندوق کے پاس

جا کر اس پر سے ایک ٹوٹا ہوا چھوٹا سا لکڑی کا کیش بکس۔ ایک مہا بھارت کی پوتھی اور کئی ایک خالی شیشیوں کو الگ رکھا اور صندوق کھول ڈالا۔ صندوق کے اندر کئی ایک گٹھڑی پوٹلی نکالنے کے بعد سب سے نیچے کاغذ کا ایک پلندہ نکلا۔ جو کئی کپڑوں میں یکے بعد دیگرے نہایت مضبوط بندھا ہوا تھا۔ تو اس میں نوٹ تھے!

چوڑامن نے نوٹوں کو اپنے قبضہ میں کر لیا۔ باقی سب چیزوں کو جلد جلد اُن کی جگہ پر رکھ کر صندوق بند کر دیا پھر مہا بھارت کی پوتھی۔ ٹوٹا ہوا بکس اور دوائیوں کی شیشیاں بھی ویسے ہی رکھ دیں۔ چراغ بجھا دروازہ میں تالا لگا اپنی کوٹھڑی میں آ گئے۔ تکیہ کے نیچے سے چشمہ نکال کر آنکھوں پر لگایا۔ اور پلندہ کھولکر نوٹوں کی جانچ پڑتال شروع کی سب نوٹ دس دس روپیہ کے تھے۔ ایک بھی بڑی قیمت کا نہ تھا ایک مٹھا نوٹوں کا گن کر دیکھا تو معلوم ہوا۔ اس میں سو نوٹ ہیں۔ چونکہ اسی طرح کے دس مٹھے تھے۔ اسی لئے معلوم ہوا۔ کہ سب نوٹ گنتی میں ایکہزار اور مالیت میں دس ہزار کے ہیں گویا افواہ سچ تھی۔ اور چندر کانت کی موت پر چوڑامن اپنی چالبازی سے دس ہزار کے مالک بن گئے۔

نوٹوں کو ایکبار گننے سے تسلی نہ ہوئی اس لئے چوڑامن

نے بار بار گِن کر اپنا اطمینان کرنا شروع کیا۔ اسی طرح کپڑے میں تہ در تہ باندھ کر پھر اپنے صندوق میں بند کر کے کوٹھڑی سے باہر نکلا۔ اُس وقت سورج طلوع ہونے کے قریب تھا کوے شور مچانے لگے تھے۔ چڑامن لوٹا ہاتھ میں لیکر گھر سے باہر نکلے۔ اور آم کے باغ سے گذر کر تالاب کے کنارے پہنچے۔ ادھر اُدھر نظر دوڑائی۔ جب کوئی شخص دکھائی نہ دیا تو جلدی سے لوہے کی صندوق کی کنجی دھوتی میں سے نکال کر تالاب میں پھینک دی۔

اس کے بعد اطمینان سے ہاتھ مُنہ دھو کے لوٹے میں پانی بھر آہستہ آہستہ گھر کی طرف چلے۔

(۴)

نو بجے کی گاڑی سے نوکمار آ پہنچا۔ اس کے آتے ہی گھر میں پھر آہ وزاری شروع ہو گئی۔ آواز سُن کر پڑوسی آ جمع ہوئے اور اس کو سمجھانے لگے۔ سب نے تسلی بندھانے والے لب ولہجہ میں کہا۔

نوکمار بابو رودمت۔ چُپ ہو جاؤ۔ ماں باپ سدا کس کے جیتے ہیں۔ جو تم اُن کے ہمیشہ جیتے رہنے کی اُمید کرتے تھے اب تمہارے باپ کی جگہ چچا جی ہیں انہی کو اپنا پتا سمجھو

اور ان کی ٹہل سیوا کرو۔"

جاتے ہوئے سب پڑوسی آپس میں کہنے لگے۔

" دیکھو تو بیچارے چوڑامن کا چہرہ ایک ہی دن میں کیسا ہو گیا۔ بڑھاپے کا صدمہ۔ غریب کی آنکھیں اندر گھس گئیں۔ معلوم ہوتا ہے کئی مہینوں کا بیمار ہے۔"

ایک نے کہا۔

بھائی کا غم ایسا ہی ہوتا ہے بیچارہ سوکھ کر کانٹا ہو گیا تھا۔

دوسرے نے کہا۔

" اب بھائی کے رنج میں چوڑامن بھی بہت دن نہ بچیگا لیکن چوڑامن کے جسم کی حالت اور چہرے کی اداسی کی حقیقی وجہ جو تمام رات کی شب بیداری تھی۔ اس کو کوئی بھی نہ پہچان سکا۔ نو کمار نے دوپہر میں چچا کے ساتھ کھانا کھایا۔ کھانا کھا کر چوڑامن چٹائی پر بیٹھ کر حقہ پینے لگے۔ نو کمار ان کے پاس چپ چاپ بیٹھ گیا۔

چچا جی نے کہا۔

" شرادھ کے سامان کا انتظام تو ابھی سے کرنا ٹھیک ہو گا۔ کچھ روپیہ ساتھ لائے ہو؟"

نو کمار نے کہا۔"

میرے پاس روپیہ پیسہ کہاں؟ جو کچھ بس اندازہ ہوتا تھا سب یہاں بھیج دیتا تھا۔ پتا جی کے صندوق سے کچھ نکل آئے تو کام چلے۔

" دیکھو تو شاید کچھ ہو۔ اُمید تو نہیں"

" کُنجی کہاں ہے؟ — نوکمار نے پُوچھا۔

چچا بولے۔

" میں نہیں کہہ سکتا۔ شاید بھُوجی کو دے گئے ہوں اُن سے پُوچھو۔

نوکمار نے ساونتری سے جاکر پُوچھا۔ ساونتری نے کہا۔

" مجھ کو تو کُنجی نہیں دیگئے۔ مرتے دم تک تو کُنجی اُن کی کمر میں ڈورے سے بندھی تھی۔ شاید چچا نے کھول لی ہوگی

نوکمار بولے"

" نہیں۔ انہیں تو کچھ معلوم نہیں۔ وہ نہیں جانتے کُنجی کیا ہوئی کِس نے لی۔ یہ بھی انہیں معلوم نہیں"

نوکمار نے یہ بات چچا سے آکر کہی۔ انہوں نے کہا۔

" ٹھیک ہے کُنجی اُن کی کمر میں ہی رہ گئی۔ جلدی میں اس کا کسی نے خیال ہی نہیں کیا۔

" تو کیا چابی لینا آپ بالکل ہی بھُول گئے — نوکمار نے پُوچھا۔

چچا چوڑامن چکرورتی حقہ نیچے رکھ رونی صورت بنا کر لڑکھڑاتی زبان سے بولے

"ارے بابو! اس وقت میرے من کی حالت روپیہ پیسہ یا چابی کنجی لینے کی تھی۔ مجھ پر جو گذری ہے۔ وہ تو میں ہی جانتا ہوں۔ اگر تم ہوتے۔ جب تو سب کچھ ہو سکتا تھا"۔

نوکمار کچھ دیر چپ رہا۔ آخر چچا کو حقہ پی کر جاتے دیکھ کر بولا۔

"پھر اب کیا ہوگا؟

"ہوگا کیا؟ — چچا نے جواب دیا — لوہار بلا کر صندوق کھلوا لو"۔

(۳)

غرضیکہ لوہار کو بلا کر صندوق کھلوایا گیا۔ صندوق میں سے صرف تیس پینتیس روپے نقد اور نوکمار کی سورگباشی ماں کے کبھی ایک سونے چاندی کے پرانے زیور نکلے اور بس۔ یہ دیکھ کر نوکمار سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔ وہ یہی سمجھ رہا تھا کہ اس کے پتا جی کے صندوق میں دس ہزار روپیہ ہے اسے شک بھی ہوا کہ چچا نے روپیہ نکال کر کہیں الگ کر

دیا ہوگا۔ مگر اس کا کوئی فیصلہ کُن ثبوت نہ تھا۔

نو کمار کھلے ہوئے صندوق کے سامنے بیٹھ کر بحرِ فکر میں غوطے کھا رہا تھا کہ چچا نے آکر پوچھا۔

" کچھ ملا ؟"

صندوق سے جو کچھ نکلا تھا۔ نو کمار نے چچا کے آگے رکھ دیا بعد میں اُس نے کہا "

" صندوق میں دس ہزار روپیہ تھا۔ وہ کیا ہوا ؟"

چچا امن حیران ہو کر بولے۔

کتنا روپیہ ؟ دس ہزار !"

چچا کا چہرہ زرد ہو گیا۔ اُنھوں نے کچھ ہنس کر کہا۔

" دس ہزار روپیہ.... بیٹا تم پاگل ہو گئے ہو۔ دس ہزار روپیہ ان بیچاروں کے پاس کہاں سے آیا ؟

" کہاں سے آیا ___ نو کمار نے کہا ___ یہ میں نہیں جانتا سب لوگ کہتے تھے۔ کہ اس صندوق میں دس ہزار روپیہ موجود ہے۔

" پھر لوگوں کے کہنے سے کیا ؟ بھائی صاحب تو برابر کہتے رہے کہ اُن کے ہاتھ میں ایک پیسہ بھی نہیں۔ تم کبھی کچھ سے جو کچھ روپیہ پیسہ بھیج دیا کرتے تھے۔ اس سے تو گھر کا سب خرچ چلاتے تھے۔ اور مہینے میں دو ایک روپیہ بچ جاتا تھا۔ اُسے جمع رکھتے

کھٹے۔ دس ہزار روپیہ! بابو دس ہزار روپیہ جمع کرنا ہنسی کا کھیل نہیں ہے۔ اوسط درجہ کے آدمیوں کے پاس اتنا روپیہ ہونا ناممکن ہے نوکمار بیچارہ کیا کرتا۔ چپ ہو رہا چچا کے اوپر جو غصہ اور شک ہوا تھا۔ اس کو اپنے من میں ہی رکھ کر اس نے باپ کا شرادھ مناسب وقت پر کیا۔ کچھ دن بعد نوکمار کی چھٹی ختم ہو گئی۔ ایک تو باپ کے مرنے کا غم۔ دوسرے، روپیہ غائب ہونے کا افسوس، نوکمار کے نازک دل پر سخت چوٹ لگی۔ اس کے پاس اتنی پونجی نہ رہی تھی کہ کچھ دن اور گھر پر رہ سکتا۔

آخر اس نے اپنی ملازمت پر جانے کا ہی فیصلہ کیا۔ اب تک وہ اپنی بہو ساوتری کو ہمیشہ کچھ مدت کیلئے گھر پر چھوڑے ہوئے تھا۔ لیکن اب اس نے ارادہ کر لیا۔ کہ ساوتری کو اپنے ساتھ لیتا جائے۔ اور وہیں رکھے۔ چلتے وقت اس نے ساوتری سے کہا کہ

"میں دسہرے کی تعطیلوں میں آؤنگا۔ اس اثناء میں مکان وغیرہ کا انتظام کر کے اس وقت تمہیں اپنے ساتھ لے جاؤں گا!"

(۵)

نوکمار گھر سے رخصت ہو کر پہلے کلکتہ پہنچا۔ وہاں اس نے ماں کا چاندی سونے کا زیور فروخت کر کے کچھ کپڑے وغیرہ

ضروری چیزیں خریدنی تھیں۔ چنانچہ اس نے بہو بازار سے بڑے بازار تک دن بھر گھوم کر ڈھائی سو روپیہ میں کل زیورات فروخت کر ڈالے۔ بڑے بازار سے ایک مارواڑی کی دوکان پر بیٹھ کر کچھ کپڑا مول لیا۔ پاکٹ بک میں نوٹ تھے۔ دام دینے کے لئے پاکٹ بک نکالنی چاہی تو معلوم ہوا۔ کہ پاکٹ بک ہی غائب ہے نوٹوں کا کہیں پتہ نہیں۔

کسی گرہ کٹ نے جیب کاٹ کر پاکٹ بک اڑالی۔ اور اسے معلوم تک نہ ہوا۔ بیچارہ ہاتھ مل کر رہ گیا۔ آفت پر آفت یہ کہ اس پاکٹ بک میں ہی اس کا واپسی ٹکٹ بھی تھا۔ ڈھائی سو روپیہ کے نوٹ اور کچھ پرانی خط وکتابت اس کے علاوہ تھی۔ کپڑے دوکاندار کو واپس کر کے نوکمار اپنی قیامگاہ پر لوٹ آیا۔ اس کا ارادہ آج ہی پنجاب میل سے اپنی ملازمت پر جانیکا تھا۔ لیکن اب اس کے پاس اتنی رقم بھی نہیں تھی۔ کہ وہ نیا ٹکٹ خرید کر ہی چلا جائے اس لیئے اس نے سوچا۔ کہ کل جب سنہیا نند آئیگا۔ تو اس سے دفتر میں ملکر کچھ قرضہ لے لوں گا۔"

نوکمار نے بمشکل وہ رات کاٹی صبح ہونے پر وہ چارپائی پر ہی پڑا رہا۔ رنج کے مارے اس کا دل اٹھنے کو نہ کیا۔ اتنے میں وہاں کے ایک موٹے سے بابو ایک اخبار ہاتھ میں لیئے آئے اور بولے

" نوکمار بابو دیکھئے! الیشور جو کچھ کرتے ہیں۔ اچھا ہی کرتے ہیں۔

کل جو آپکی پاکٹ بُک چوری ہوگئی تھی اس نے ....."
نو کمار نے چونک کر اور بیچ میں بات کاٹ کر کہا۔
"کیوں؟ کچھ نیا حال ہے؟"
موٹے بابو نے پڑھ کر سنایا۔
"کل رات پنجاب میل آسنسول کے قریب مال گاڑی سے ٹکرا گئی۔ انجن کے قریب کی دو تین گاڑیاں جن میں مسافر بھرے ہوئے تھے۔ چور چور ہو گئیں۔ ڈرائیور سے کودنے کی کوشش میں سخت زخمی ہو گیا۔ اور ہسپتال میں پڑا ہے مسافروں میں سے چھ کی لاشیں پائی گئیں۔ اور بائیس سخت زخمی ہوئے۔ جو شفا خانہ میں پڑے ہیں۔ ان میں سے اکثر کے بچنے کی بہت کم امید ہے۔ مردہ آدمیوں کی فہرست دیکھئے ان میں نو کمار چکرورتی کا نام بھی ہے۔"
"کہئیے کیسی خوفناک خبر ہے۔ کیا آپ ہی مر گئے ہیں۔"
"نو کمار بولا۔
"معلوم ہوتا ہے میرے نام کا کوئی اور شخص ہو گا۔"
موٹے بابو نے کہا۔
"لیکن آپ بھی تو کل رات کی گاڑی سے جانیوالے تھے۔ کون جانے کہیں بھوت بن کر یہاں نہ آ گئے ہوں۔"
یہ کہہ کر وہ موٹے بابو تو چلے گئے۔ مگر نو کمار کے دل میں انکی

باتوں سے ایک نیا خیال پیدا ہو گیا۔ وہ فوراً ہی منہ ہاتھ دھو بھوجن کر ستیا شند سے کچھ روپیہ لے اسنسول پہنچا۔ وہاں جا کر اس نے تھانے میں داروغہ جی سے پوچھا۔

" نوکمار چکرورتی جو یہاں مر گیا ہے اس کا نام کیسے معلوم ہوا؟"

داروغہ جی نے کہا۔

اس کی جیب سے یہ پاکٹ بک نکلی ہے۔

نوکمار نے دیکھا۔ یہ ایسی پاکٹ بک تھی جس میں اسکے نوٹ چھٹیاں اور واپسی ٹکٹ سب کچھ موجود تھا۔ اس نے جو.... سوچا تھا۔ وہی ہوا۔ اسکی جیب کاٹنے والا گرہ کٹ مارا گیا۔ پاپ کا اس طرح پھل ملتا ہوا آج کل اتفاق سے نظر پڑتا ہے"

داروغہ جی نے پوچھا۔

" آپ کون ہیں؟"

" نوکمار بولا۔

" میں نوکمار کا ایک دوست ہوں۔ داروغہ صاحب لاش کا کیا ہوگا؟"

داروغہ جی کہنے لگے۔

" ضروری تحقیقات کے بعد ہم نے اخبار میں شائع کروا دیا ہے

مرحوم کا کوئی رشتہ دار لاش جلانے کا انتظام کریگا۔ تو خیر۔ ورنہ ہم اس کو زمین میں دفن کر دیں گے "

نوکمار نے خیال کیا کہ اگر لاش کو زمین میں دفن کرا دیا جائے تو بھی کیا حرج ہے لیکن پھر اس نے سوچا۔ کہ اگر خبر پا کر چچا جی آگئے۔ تو لاش دیکھ کر وہ آسانی سے پہچان جائیں گے۔ کہ یہ لاش میری نہیں ہے۔ اس لئے اس نے داروغہ جی سے لاش جلانے کی اجازت چاہی۔ داروغہ جی نے دریافت کیا۔

"اُس کے روپے پیسے کا وارث کون ہے ؟"

نوکمار نے کہا۔

"مرحوم کی بیوی ہے۔ چچا ہے، وارث اس کی بیوی ہوگی اس کے چچا کو خبر دیجئے۔ وہ آکر روپیہ لے جائیں گے "

داروغہ نے نوکمار کے چچا کا نام اور پتہ لکھ لیا۔ لاش جلا کر نوکمار کلکتے لوٹ آیا۔ موٹے بابو نوکمار سے پوچھا۔

کہیئے کیا خبر ہے ؟"

نوکمار نے کہا۔

"میں نے جا کر دیکھا کوئی اور شخص تھا "

بابو نے کہا۔

یہ بھی اچھا ہی ہوا۔ آپ تو بچ گئے "

دوسرے دن نوکمار نے دفتر جا کر ستیا نند سے ملاقات

کی۔ستیانند کی زبانی اُسے معلوم ہوا۔ کہ اگرچہ دیہات میں خط نہیں جاتا۔ مگر پھر بھی آنے جانے والے لوگوں کی زبانی اس کے گھر والوں کو اس کے مر جانیکی خبر مل گئی ہے۔

اس پر نوکمار نے ستیانند کے ساتھ بڑی دیر تک آہستہ آہستہ کچھ باتیں کیں اور اپنی قیامگاہ پر لوٹ آیا۔

(۶)

شام کا وقت تھا۔ چوڑامن اپنی بیٹھک میں چٹائی پر بیٹھے حقہ پی رہے تھے۔ ہمسایہ کے دو چار بزرگ ان کے پاس بیٹھے تھے۔ کل نوکمار کا شرادھ ہو چکا تھا۔ بڑے بوڑھوں کا شرادھ جس دھوم دھام سے ہوتا ہے۔ جوانمرگ کا ویسا نہیں ہوتا۔

چوڑامن آسنسول سے جو ڈھائی سو روپیہ کے نوٹ لائے تھے۔ ان میں سے صرف پچاس روپے انہوں نے نوکمار کے شرادھ میں لگادئے اور باقی دو سو روپیہ نوکمار کی بدھوا ساوتری کو دیدیا۔ ساوتری جب سہاگن تھی۔ تب اس کی خوش نصیبی کا ہر طرف چرچا تھا۔ اب سب کی زبان پر اس کی بدقسمتی کی رام کہانی ہے۔ اس کو بھی سخت صدمہ پہنچا ہے۔ جس دن اس نے اپنے شوہر کے مرنے کی خبر سُنی۔ اس

روز تو وہ دن بھر روتی رہی۔ رات کو ستیا نند کی استری نے اس کو بہت سمجھایا۔ دوسرے دن وہ سست رہی۔ مگر پھر بعد میں جلد ہی اس کی معمولی حالت ہو گئی۔ بدھوا ہونے پر جیسا رنج ہونا چاہیئے تھا۔ ویسا اس کو نہیں دیکھ پڑتا۔ وہ روز دوپہر کو ستیا نند کی استری کے پاس جاتی۔ اور دن بھر وہیں بیٹھی رہتی تھی۔ اس پر گاؤں کی چند منہ پھٹ عورتیں چہ میگوئیاں بھی کرنے لگی تھیں"

بیٹھک میں ہر شخص حقہ گڑ گڑا کر دوسرے کے ہاتھ میں دے دیتا ہے لیکن بولتا کچھ نہیں۔ سب کے چہرے سست ہیں۔ اگر کوئی ٹھنڈا سانس لے کر کچھ بولتا بھی ہے تو یہ کہ....

"دنیا چند روزہ ہے۔ بس موہ مایا ہے۔ مرنے کے وقت صرف دھرم ہی ساتھ دیتا ہے"

کوئی کہتا"

"نوکمار بہت اچھا تھا۔ آج کل ویسا خوش اخلاق لڑکا دیکھنے میں نہیں آیا۔

غرضیکہ نوکمار کی موت پر سب اس طرح افسوس ظاہر کر رہے تھے۔ کہ اتنے میں باہر کسی کے دوڑنے کی آہٹ سنائی دی۔ ایک ہی منٹ میں ایک نوکر ہانپتا ہانپتا بیٹھک میں گھس آیا۔ اس کا جسم خوف سے تھر تھر کانپ رہا تھا۔ اس نے

اُوپر کی طرف دم کھینچتے کھینچتے صرف دو بار " مالک مالک " کہا اس کے سوا اس کے مُنہ سے اور کچھ نہ نکلا۔ پھر وہ بیہوش ہو کر گر پڑا۔

سب لوگ اس کی یہ حالت دیکھ کر ڈر گئے۔ اور بیہوشی دُور کرنے کیلئے طرح طرح کی تدبیریں کام میں لانے لگے۔ بہت دیر بعد جب اس کو ہوش آیا۔ تو لوگوں نے اس سے پُوچھا "

" کیا ہے ارے نتھو! تجھے کیا ہو گیا تھا؟ "

نتھو نے خوف سے کانپتے ہوئے کہا۔

" رام رام کیا کہوں بھُوت دیکھا ہے! "

اُن میں سے ایک بزرگ نے جنہوں نے بچپن میں کچھ انگریزی پڑھی تھی۔ کہا۔

" دھت تیرے کی! بھُوت دیکھا ہے۔ بھُوت ہے کہاں جو دیکھے گا! وہم ہو گیا ہے وہم "

نتھو نے آنکھیں پھاڑ کر کہا

" کیا۔ کہتے ہو بابو۔ بھُوت نہیں ہے؟ بابو اُس تالاب کے پاس بانسوں میں چل کر دیکھئے تو سہی۔ تب پتہ لگے۔ باپ رے باپ "

بہت پوچھنے پر نتھو نے کہا۔

" کچھ دیر ہو گئی۔ جب میں تالاب سے برتن مانج کر واپس

آ رہا تھا۔ پوکھر کے اُتر میں بانسوں کے اندر اندھیرے میں کیا دیکھتا ہوں۔ کہ ایک آدمی سر سے پاؤں تک سارے جسم پر سفید کپڑا پہنے آہستہ آہستہ ٹہل رہا ہے۔ جب میں اس کے نزدیک پہنچا۔ تب اس کا چہرہ ٹھیک نوکر بابو جیسا دیکھ پڑا۔ اس نے تنگنی آواز سے کہا۔

"اوں نتھوا۔ انہیک بانر چانچاں جیں کوں میرے پاس بھیج دیں۔"

"یہ سنتے ہی میں سب کانسی پیتل کے برتنوں کو پھینک پھانک کر اپنی جان بچا کر وہاں سے بھاگ آیا۔"

یہ سُن کر چچا چوڑامن جی ایشور کو یاد کرنے لگے۔ اُنہوں نے ڈرتے ہوئے پُوچھا۔

"تم نے ٹھیک دیکھا ہے کیا؟"

"نتھو بولا۔"

"ارے ٹھیک نہیں تو کیا اب ٹھیک دیکھا ہے۔ مالک، ارے دادا اب میں سندھیا کو تالاب پر برتن دھونے کبھی نہ جاؤں گا۔ میرے ماں باپ کے پُن سے آج میری جان بچ گئی۔"

انگریزی پڑھے بزرگ نے کہا۔

"چکرورتی مہاشے کیا آپ اس کی بات پر یقین کرتے

ہیں؟ اس نشے باز نے بیوقوفی سے کوئی برتن پھوڑ ڈالا ہے۔ اس لئے یہ جھوٹی بات بنا کر کہنے آیا ہے تاکہ آپ اس پر ناراض نہ ہوں۔"

کہنے کو وہ یہ بات کہہ رہے تھے لیکن سچ تو یہ ہے کہ یہ کہتے ہوئے بھی پرانے اثرات کی بدولت ان کی چھاتی دھڑک رہی تھی۔ یہ باتیں سنتے ہی سب ڈر کے مارے اُٹھ کر اپنے اپنے گھر کو چلے گئے۔"

(۷)

چوڑامن کو تمام رات خوف اور فکر کی وجہ سے نیند نہ آئی نتھو کی بات کو تو جھوٹ کر لوگوں نے اڑا دیا تھا لیکن دوسرے دن محلے کے اچھے اچھے قابل اعتبار لوگوں نے آکر چوڑامن کو خبر دی کہ کسی نے تالاب کے گھاٹ پر ٹوٹے پھوٹے برتنوں والے کے قریب اور ہی کسی جگہ نو کمار کو دیکھا ہے۔

سارے محلے میں بھوت کا شور مچ گیا۔ کتنے ہی لوگ رات کو اکیلے باہر جاتے ہوئے خوف کھانے لگے انگریزی داں بزرگ بھی کبھی اندھیرا ہونے کے بعد اپنے گھر سے باہر دکھائی نہیں دیتے۔

کسی نے چوڑامن چکرورتی کی بیٹھک میں آکر کہا۔

شاستر کا بچن کبھی جھوٹا نہیں ہو سکتا۔ تو کمار بے موت مرا ہے۔ اس لئے ایسا ہونا ہی ضروری ہے۔ خیریت یہ ہے کہ بچارا بھوت ہو کر بھی کسی کو ستاتا نہیں۔ آپ گیا جی جا کر اس کو پنڈ دے آئیے۔ اس بھوت یونی سے اس کا چھٹکارا ہو جائے گا۔"

ایک دن شام کے وقت چڑامن تالاب کے گھاٹ سے منہ ہاتھ دھو کر پانی سے بھرا لوٹا ہاتھ میں لئے آم کے باغ میں سے ہو کر گھر واپس آ رہے تھے۔ اتفاقاً ایک سفید پوش مرد ان کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ اس کا سارا جسم سفید کپڑے سے چھپا ہوا تھا۔ صرف چہرہ کسی قدر کھلا ہوا تھا۔ اس نے کہا۔

"چاچا جی وہ دس ہزار روپیہ

اتنا سنتے ہی چاچا جی کے ہوش اڑ گئے۔ وہیں لوٹا پھینک رام رام کرتے ہوئے گھر کی طرف بھاگے۔ دوسرے دن اماوس تھی۔ شام ہونے کے بعد وہ گھر سے بھی نہ نکلے نو بجے رات کو کھانا کھا کر سو رہے۔ خوب گہری نیند میں مست تھے۔ سب جگہ خاموشی چھا رہی تھی۔ تقریباً آدھی رات کو جسم میں کسی کا ٹھنڈا ہاتھ لگتے ہی چاچا جی کی آنکھ کھل گئی۔ وہ چونک پڑے اور آنکھیں بند کئے

ہی چوکنے ہو کر بولے۔

"کون ہے؟"

جواب ملا

"میں ہوں نوکمار"

یہ سنتے ہی چچا کی گویا جان ہی نکل گئی۔ وہ خوف سے ٹھٹھر سے ہو کر لکڑی کے کندے کی طرح خاموش پڑے رہے کچھ بولنے کی ہمت نہ ہوئی۔

بھوت نے کہا۔

"دو دس ہزار روپیہ جب تک تم میری بیوی کو نہ دو گے تب تک میں روز تقاضا کرنے آؤں گا۔ روز آؤں گا ہر روز"

یہ کہہ کر نوکمار چپ ہو رہا۔ یہ زندہ بھوت کون تھا۔ ناظرین ضرور سمجھ ہی گئے ہوں گے لیکن چچا کچھ نہ سمجھے ان کی سانس جلد جلد اوپر ہی اوپر چلنے لگا۔ آنکھیں بند ہو گئیں۔ دانت پر دانت جم گئے۔ غشی سی طاری ہو گئی۔ نوکمار کھلی ہوئی کھڑکی سے آہستہ آہستہ باہر نکل گیا

(۸)

اگلے دن شام کے وقت ستیا نند نے دفتر سے لوٹ کر نوکمار کو خبر دی کہ چچا امن نو بجے کی گاڑی سے کلکتہ گئے

تھے۔ ساوتری کے نام سے دس ہزار روپیہ کے پرامیسری نوٹ
خرید لائے ہیں۔ میں نے پوچھا تھا۔ کہ یہ روپیہ کہاں سے آیا؟
انہوں نے جواب دیا۔ "روپیہ میرے بھائی جی کا ہی ہے۔
سب لوگ کہتے تھے۔ کہ ان کے پاس دس ہزار روپیہ ہے
یہ بات جھوٹ نہ تھی۔ لیکن یہ روپیہ ان کے لوہے کے صندوق
سے نہیں نکلا۔ اتفاقیہ کل رات میں نے ان کا ایک پرانا ٹین کا
بکس کھولکر دیکھا تھا۔ اس میں کپڑے کے اندر تہ در تہ بندھا
ہوا دس ہزار روپیہ کے نوٹوں کا ایک پلندہ ملا۔ دیکھ کر مجھے
بہت خوشی ہوئی۔ ہائے اگر آج نوبو زندہ ہوتا۔ تو اپنے پتا کا
جمع کیا ہوا روپیہ پاکر کیسا خوش ہوتا۔ اچھا خیر اس روپیہ
سے اس کی بدھوا کا رنڈاپہ تو آرام سے کٹے گا۔ بابو میں
ایسا ادھرمی نہیں ہوں۔ کہ دوسرے کا روپیہ میں ہضم کر جاؤں
اب مجھے کتنے دن جینا ہے۔ جو یہ پاپ کماؤں گا"

بعد ازاں نوکمار نے کلکتہ جاکر اپنے چچا کے نام ایک
خط لکھا جس میں تحریر تھا۔ کہ مجھے یہ سنکر سخت افسوس
ہوا۔ کہ لوگوں نے جھوٹ موٹ میرے مرنے کی خبر اڑا دی ہے
میں اب تک بخیریت ہوں۔ ایک کام سے باہر گیا تھا۔ اگلے
اتوار کو گھر آؤں گا۔ ایک دن رہ کر اپنی بیوی کو اپنے ساتھ لے
جاؤں گا۔"

جب انوار کو نوکھمار گھر آیا۔ تو اُسے معلوم ہوا۔ چچا چنڑامن کسی ضروری کام سے دُوسرے گاؤں گئے ہیں اس لئے نوکھمار کی چچا سے ملاقات نہ ہوسکی۔ اور وہ اپنی بیوی کو ساتھ لے کر اپنی ملازمت پر چلا گیا۔"

گناہ یا شاعری

چودھویں
کا چاند اور آگرہ کا تاج محل۔ گویا برکھا کی رات اور دو حسین جوانیاں..... جاننے والے جانتے ہیں۔ اور انجان اس لطف بے پایاں سے محروم!
ملک کا رفیع القدر شاعر اس دلکش اور خوبصورت منظر سے لطف اندوز ہو رہا ہے کبھی محو کبھی بے چین، کبھی تصورات اور کبھی اپنے تصورات اور تخیلات کی لطیف اور رومان انگیزی کے ساتھ۔ سامنے کی روش پر شاعر..... مجسم شاعر بلکہ ہمہ تن شاعر معصومیت کیساتھ، فطرت کی رنگینیوں سے محظوظ ہو رہا ہے کبھی کبھی اپنے رنگین نغمات سے فضائے لطیف کو معطر اور

خوش گوار بنا دیتا ہے کبھی خوش، انتہائی مسرور، اور کبھی رنجیدہ کسی اندرونی کلفت سے مضطرب ......"

دفعتاً نشیب کی جھاڑیوں کو جنبش ہوئی۔ شاعر کے لئے اس پُرلطف تنہائی اور مکمل سکوت کے عالم میں کسی اجنبی وجود کا احساس سخت تکلیف دہ تھا۔ اس کا نازک اور احساس دل بارگراں کو برداشت کرنے کے قابل نہ تھا اجنبی کا ہاتھ فضا میں بلند ہوا۔ اور اپنی پوری طاقت کے ساتھ شاعر کے سر پر حملہ آور ہوا۔

ایک ترنم خیز، شاعرانہ مگر دلدوز چیخ کے ساتھ شاعر اعظم خاک و خون میں تڑپ کر بیہوش ہو گیا۔

اجنبی حملہ آور چاند کی شفاف روشنی میں اپنے شکار کی صورت غور سے دیکھتا ہے، افسوس" اس کی زبان سے نکلا۔ اور فوراً ہی وہاں سے فرار ہو گیا۔ اس نے غلطی سے انتقام کے جوش میں شاعر کو اپنا حریف سمجھ کر حملہ کر دیا تھا۔

چند خوش باش نوجوانوں کا گروہ تفریحاً اس طرف آ نکلتا ہے۔ پولیس مطلع ہو کر فوراً مجروح کو طبّی امداد پہنچاتی ہے ساتھ ہی مجرم مشتبہ حالات میں بھاگتا ہوا گرفتار کر لیا جاتا ہے

(۲)

ایک ماہ بعد شاعر صحتیاب ہو جاتا ہے اور ملزم کی شناخت

کے لئے کارروائی کیجاتی ہے۔ ملزم جیل کے آہنی دروازہ کے سامنے کھڑا ہے۔ شاعر کی نگاہیں ملزم کے چہرے سے اس کے اندرونی جذبات کا جائزہ لیتی ہیں اور خباشت کے سوا کچھ نہیں پاتیں شاعر اعظم شناخت کی کارروائی مکمل کرنے کے بعد اپنے شاعرانہ دورہ پر روانہ ہو جاتا ہے وہ کبھی ایک جگہ نہیں رہتا آج یہاں ہے تو کل وہاں۔ کیونکہ وہ "ہمہ تن محبت" اور "ہمہ تن اعتراف" ہے۔ اسی کے معنی ہیں شاعر"

شاعر کے نام کا سفینہ جاری ہوتا ہے لیکن اس کی شاعرانہ سیاحی کیوجہ سے سفینہ کی تعمیل چھ ماہ تک نہیں ہوتی۔

اتفاقاً ایک بڑے مشاعرہ میں عین غزل سناتے وقت سفینہ کی تعمیل ہو جاتی ہے۔

پیشی کی تاریخ پر شاعر اعظم عدالت میں آتا ہے۔ عدالتی کارروائی شروع ہوتی ہے۔ شاعر سے سوال کیا جاتا ہے۔

"تم اپنا نام، ولدیت، سکونت اور پیشہ ظاہر کرو"

"اس کے دریافت کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ عدالت سب کچھ جانتی ہے۔ اور سفینہ پر سب کچھ درج ہے۔

عدالت پر خاموشی چھا جاتی ہے۔ کچھ وقفہ کے بعد پھر سوال کیا جاتا ہے۔

"ملزم کے متعلق الزام ہے۔ کہ اس نے تم پر بغاوت تاج فاقلانہ

حملہ کیا جس سے تم کو ضرب شدید آئی۔ کیا تم اس کو بخوبی جانتے ہو؟ کیا یہ وہی شخص ہے؟"

شاعر کی نظریں غیر ارادی طور پر ملزم کے افسردہ اور زرد چہرہ پر پڑیں۔ اب اس کے چہرہ پر بجائے خباشت کے ندامت اور شرمندگی کے آثار نمایاں تھے۔

ملزم کی خاموش لیکن طالب رحم نظریں شاعر کی طرف اُٹھتی ہیں۔ پھر شرمندگی اور ندامت کے ساتھ جھک جاتی ہیں۔ شاعر کانپ اُٹھتا ہے لرز جاتا ہے اس کے شاعرانہ اصول کے بالکل برخلاف تھا۔ اگر وہ طالب کو مطلوب کے وصال سے محروم کردے۔

مگر وہ طالب کی وصال سے کیوں محروم ہوتا تھا آزادی کا طالب تھا۔ معافی کا خواستگار

عدالت سوال دُہراتی ہے۔

"کیا تم ملزم کو جانتے ہو؟"

شاعر بے ساختگی کے عالم میں جواب دیتا ہے۔

"میں نہیں جانتا"

عدالت قانونی سوال کرتی ہے۔ "تم دانستہ نہیں جانتے یا نادانستہ؟"

شاعر اضطرابی جوش کے ساتھ کہتا ہے۔ "میں دانستہ

نہیں جانتا۔"

"اس کی وجہ؟"

شاعری لاپروائی سے کہتا ہے "یہ فرصت میں بتانے کی باتیں ہیں۔"

وہ عدالت کے کٹہرہ سے واپس ہو جاتا ہے عدالت اسے بلا اجازت واپس جاتے ہوئے حیرت سے دیکھتی ہے دفعتاً جج خود آواز دیتا ہے۔

"مسٹر...... ایک منٹ کے لئے.... صرف"

شاعر اپنی جگہ پر پلٹتا ہے.... شیر کی طرح سینہ تان کر.... عدالت اس کو دیکھتی ہے پھر مسکرا کر۔

"آپ تشریف لے جا سکتے ہیں؟"

"عدم فراہمی ثبوت کی بنا پر مقدمہ خارج کر دیا جاتا ہے اور ملزم بری۔"

کیا ملک کی کوئی عدالت گذشتہ ڈیڑھ سو سال میں ایسی کوئی نظیر پیش کر سکتی ہے کہ شاعر نے مجرم کو معافی دے کر رہا کرا دیا۔ اور خود مطلوب اور طالب کے وصال کا ذریعہ بنا۔ بتلائیے شاعر نے گناہ کیا یا عدالت کے ساتھ شاعری؟

انسپکٹر

مجھے گاؤں چھوڑنا پڑا۔ کیوں؟ اس کے متعلق میں صرف چند الفاظ ہی کہوں گا۔

"میں ایک اچھے قصبے میں ڈاکٹر تھا۔ پولیس چوکی اسٹیشن کے عین مقابل میرا مکان تھا۔ جتنی دشمنی مجھ سے اور ریلوے کی ملازمت سے تھی۔ اس سے کہیں گنا زیادہ دوستی انسپکٹر پولیس سے تھی ہمارا ان کی جوڑی سے جو بھلائی دنیا کی ہو سکتی ہے۔ اس کو میں بخوبی جانتا تھا۔ جیسے زیور سے کپڑے کی اور کپڑے زیور کی خوبصورتی ہوتی ہے۔ ویسے ہی اس حالت میں مجھ سے پولیس انسپکٹر کی اور میری پولیس انسپکٹر سے بھلائی ہونے لگی۔ ہاتھ کو ہاتھ پہچانتا ہے۔

اسی وجہ سے زمانہ حال کے اصول کے مطابق ہم دونوں

کی دوستی تھی۔ اُن کے مکان میں اُن کی ایک رشتہ دار لڑکی رہتی تھی۔ اس کا اور کوئی نہ تھا۔ انسپکٹر صاحب اس کے ساتھ شادی کرنے کے لئے مجھے روزانہ مجبور کیا کرتے تھے۔

میری ایک لڑکی تھی۔ مجھے وہ بہت پیاری تھی میں نے اس کا نام چونی رکھا تھا۔ اس کی ماں دوسری دنیا میں چلی گئی تھی۔ اپنی پیاری بچی سوتیلی ماں کو کیسے سونپ سکتا تھا۔ ہر سال کئی دن مقرر ہوتے۔ مگر سب فضول میری آنکھوں کے سامنے شادیاں ہوئیں۔ میں خود بہت سی پارٹیوں میں شامل ہوا۔ مگر خود ریوں کا توں ہی رہا۔

چُونی بارہ سال کی ہو گئی۔ تیرواں شروع ہوا۔ میرا خیال تھا کہ میں جلدی ہی اتنا روپیہ کر لوں گا۔ جس سے کسی اچھے بڑے گھر میں لڑکی شادی کر سکونگا۔ اس کام کے بعد دوسرے اپنے کام کی تیاری شروع کر دوں گا۔“

میں انہیں خیالات میں متغرق تھا کہ منشی گنج کے کیدارناتھ اندر داخل ہوئے اور چٹائی پر میرے پاؤں کے قریب بیٹھ کر رونے لگے۔ میں کرسی پر بیٹھا ہوا تھا۔ ان کی زبانی معلوم ہوا کہ ان کی بیوہ لڑکی یکایک کل شب کو راہی ملکِ عدم ہو گئی ہے اور ان کے کسی دشمن نے انسپکٹر صاحب کو ایک خفیہ چٹھی لکھی ہے کہ لڑکی حاملہ تھی۔ اس کا حمل گراتے ہوئے اس کی جان نکل

گئی ہے اور اس وقت پولیس انہیں بہت تنگ کر رہی ہے۔ لاش کو پوسٹ مارٹم کے لئے شفا خانہ میں پہنچانا چاہتی ہے۔ ایک لڑکی کی موت دوسرے یہ مصیبت، کدار ناتھ کے لئے یہ دونوں باتیں ناقابل برداشت ہیں۔ میں ڈاکٹر بھی ہوں اور انسپکٹر صاحب کا دوست بھی۔ اس لئے وہ میری امداد کے لئے حاضر ہوا ہے۔

دولت جب چاہتی ہے۔ اسی طرح بھی صدر پھاٹک اور کبھی کھڑکی کے راستے آجاتی ہے میں نے سر ہلا کر کہا۔

"معاملہ بڑا بے ڈھب ہے۔ اور پھر یہ پولیس والے دوست ہیں کس کے؟"

اسی طرح کی اور بھی کئی قسم کی باتیں بنائیں جنہیں سن کر بوڑھا کدار ناتھ زار زار رونے لگا۔ اس کے آنسوؤں کی روانی موسلا دھار بارش سے بھی زیادہ تیز تھی۔

خلاصہ کہنے کے لئے ضرورت نہیں۔ کہ لڑکی کی لاش کو صحیح و سالم جلانے کے لئے کدار ناتھ کو بالکل مفلس ہونا پڑا۔ اس وقت کجو نی کمرہ میں داخل ہوئی اور سوال کیا۔

"باپو جی! وہ بوڑھا تمہارے پاؤں پکڑ کے اس طرح کیوں رو رہا تھا؟"

میں نے اسے ڈانٹ کر کہا۔ "جا! جا!! تجھ کو ان باتوں

سے کیا مطلب ؟"

روپیہ مل جانے کی وجہ سے ایک اچھے گھرانے میں شادی کا انتظام ہو گیا۔ لڑکا پہلے ہی تلاش کر لیا گیا تھا۔ اب شادی کی تاریخ بھی مقرر ہو گئی۔ صرف ایک لڑکی تھی اور کوئی بچہ تھا ہی نہیں۔ دھوم دھام میں کچھ کسر باقی نہ رکھی۔ کوئی عورت تو تھی نہیں۔ پڑوسیوں نے خاص کر انسپکٹر صاحب کی بیوی نے بہت مدد کی۔ اور جسے میں نے روٹی کے ٹکڑے تک کا محتاج بنا دیا تھا۔ اس کیدار ناتھ نے بھی بہت کام کیا۔

شادی کے دن شب کے تین بجے چُنّی کی طبیعت بہت خراب ہو گئی۔ اُسے ہیضہ ہو گیا۔ بیماری آہستہ آہستہ خطرناک صورت اختیار کر گئی۔ بہت محنت کرنے کے بعد بیفائدہ دواؤں کی شیشیاں زمین پر پھینک کر میں کیدار ناتھ کے پاس دوڑا گیا۔ جاتے ہی اس کے پاؤں پر گر پڑا۔ اور اُسے کہا۔

"معاف کرو بھائی! مجھ گنہگار کو معاف کرو میری صرف ایک ہی لڑکی ہے۔"

کیدار ناتھ مجھے اس طرح آتے اور پاؤں پکڑتے دیکھ کر گھبرا گیا۔ اور بولا —— "ڈاکٹر صاحب! آپ یہ کیا کرتے ہیں مجھ پر آپ نے بڑا بھاری احسان کیا تھا آپ میرے پاؤں کو ہاتھ نہ لگائیں۔"

بغیر کسی جرم کے آپ کو برباد کرنے کی وجہ سے آج میری لڑکی مر رہی ہے۔ اس وقت میرے دماغ میں کچھ فتور سا آگیا تھا میں نے سب لوگوں کے سامنے روتے ہوئے چلا چلا کر کہنا شروع کیا۔ بھائیو! میں نے ان بھلے آدمی کو بالکل برباد کر دیا تھا۔ میں اس جرم کو تسلیم کرتا ہوں اور سزا بھگتنے کے لئے تیار ہوں۔ ایشور میری لڑکی کو بچائیں۔

اب میں بوڑھے کیدارناتھ کی جوتیاں پکڑ کر اپنے سر پہ مارنے لگا۔ کیدارناتھ نے جلدی سے میرے ہاتھ سے جوتا چھین لیا۔

دوسرے دن دس بجے جوئی اس دنیا سے چل بسی۔

اس کے دوسرے دن انسپکٹر صاحب نے کہا۔

"اب کس بات کی دیر ہے۔ شادی کر لو بغیر شادی کے تمہارا گذارہ نہیں ہو سکتا۔"

انسان کو اتنی تکلیف، رنج و غم اٹھانے کے بعد شیطان کو بھی یہ جرأت نہیں ہوتی۔ کہ اس کو یہ الفاظ آکر کہے۔ مگر کئی معاملات میں میں انسپکٹر صاحب کو ایسی انسانیت آئینہ دکھا چکا تھا۔ کہ اب کچھ بھی کہنے کی ضرورت نہ تھی۔ انسپکٹر نے اس دن میرے چھڑی گھونپ کر میری بےعزتی کی۔"

دل کی حالت چاہے کسی طرح کی بھی ہو۔ گاہ کرم پھر بھی گھومتا ہی رہتا ہے۔ میرا بھی کھانا، پینا، سونا، جاگنا۔ چلنا، پھرنا، اٹھنا بیٹھنا، سب معلوم ہوتا رہا۔ روزانہ کام کاج سے فرصت پانے کے بعد جب میں تنہا بیٹھتا۔ تب وہی چھوٹی کا تیز سوال میرے کانوں میں گونج پیدا کرتا۔

"باپوجی! وہ بڈھا تمہارے پاؤں پکڑ کر کیوں اس طرح رو رہا تھا؟

میں نے غریب کدارناتھ کے مکان کی مرمت اپنی گرہ سے کروا دی۔ اپنی خوبصورت گائے اُسے دے دی۔ اس کی جو زمین گروی پڑی ہوئی تھی۔ اُسے بھی چھڑا دیا۔

کچھ دن نئے غم کی تکلیف، رنج اور دکھ کی وجہ سے سناٹے میں شام کے وقت شب کی ظلمت میں مجھے یہی معلوم ہوتا۔ کہ بہشت میں بھی چھوٹی کو اپنے باپ کے اس جُرم کی وجہ سے آرام نہیں ملا۔ وہ اس بے آرامی سے گھبرا کر دل سے وہی سوال دُہراتی ہے۔

"باپوجی! تم نے ایسا کیوں کیا؟

چند دن تو ایسا ہو گیا۔ کہ کسی غریب کی دوا کر کے اس سے قیمت لینے کو دل ہی نہ چاہتا تھا۔ لیکن چھوٹی لڑکی کے بیمار ہونے پر ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے میری چھوٹی ہی اس

تکلیف میں مبتلا ہے۔

برسات میں بارش ہونے کیوجہ سے گاؤں کے چاروں طرف پانی ہی پانی ہو گیا تھا۔ اس دن صبح سے ہی بارش ہو رہی تھی۔ زمیندار کے ہاں سے پیغام آیا۔ مجھے لینے کے لئے انہوں نے ایک بڑی اعلےٰ نسل کی خوبصورت گھوڑی بھی بھیجی ملازم بار بار مجھے جلدی چلنے کے لیے کہہ رہا تھا۔ اس سے پیشتر اگر ایسے وقت میں مجھے کبھی باہر جانا ہوتا۔ تو چھُونی چھتری لاکر مجھے دیتی تھی۔ کئی دفعہ گھڑی اور دوائیوں کا بکس پکڑا دیتی۔ اور آندھی پانی سے بچنے کے لئے بار بار تاکید کرتی تھی۔

آج مجھے خود ہی چھتری تلاش کرنی پڑی۔ اور ساتھ ہی چونی کی یاد آجانے سے آنکھیں آبگوں ہو گئیں۔ رومال سے آنسُو پُونچھ کر دل پر پتھر رکھ کر میں باہر آیا۔

کشتی تھانے کے عقب میں گھاٹ پر بندھی ہوئی تھی۔ وہاں میں نے دیکھا ایک کسان لنگوٹی باندھے پانی میں کھڑا ہے۔ میں نے دریافت کیا۔

یہاں کیا کر رہے ہو؟

”جناب! کیا بتاؤں۔ کل رات میری لڑکی کو سانپ ڈس گیا تھا۔ اب تھانے میں رپورٹ لکھوانے آیا ہوں

اُس کے پاس لڑکی کی تلاش بھی تھی میں نے دیکھا تھا۔ کہ اس نے اپنی دھوتی کھول کر اُسے ڈھانپ رکھا تھا۔ زمیندار کے بامزاج ملاح نے کشتی کا سنگل کھول دیا۔ میں ایک بجے کے قریب وہاں سے لوٹ آیا۔ اس وقت بھی دیکھا کہ وہ آدمی لاش ہاتھ میں لئے وہیں کنارے پہ بیٹھا ہے ابھی تک اس کو انسپکٹر صاحب سے ملاقات ہی نہیں ہوئی۔ میں نے گھر پہنچکر اس کے کھانے کے لئے کچھ بھیج دیا۔ مگر اس نے اُسے ہاتھ تک نہیں لگایا۔ میں کھانا کھانے کے بعد پھر زمیندار کے بیمار کو دوا دینے گیا جب شام کو وہاں سے واپس آیا تب بھی اس آدمی کو اس جگہ بیٹھے دیکھا۔ میں نے سوال کیا۔

"بھائی! ابھی تک بیٹھے ہو؟"

مگر وہ بالکل خاموش رہا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا۔ کہ وہ جواب تو دینا چاہتا ہے۔ مگر الفاظ گلے میں آکر رک جاتے ہیں۔ وہ صرف میرے منہ کی طرف دیکھتا رہا۔ اب مجھے ایسا معلوم ہوا۔ جیسے اُسے اس وقت ندی گاؤں، تھانہ اور وہ آسمان کے بادلوں سے گھری ہوئی تمام زمین سب خواب کی طرح معلوم ہو رہے ہیں میں نے کئی بار سوال کو دُہرایا۔

پھر اس نے جواب دیا۔ "بہت دیر ہوئی ایک سپاہی

نے آکر دریافت کیا تھا جیب میں بھی کچھ ہے؟"

"میں بہت غریب ہوں میرے پاس ایک پیسہ بھی نہیں ہے"

میں نے جواب دیا۔

"پھر یونہی بیٹھے رہو بیٹا!" یہ کہہ سپاہی رخصت ہو گیا۔

"اس وقت سے میں یہاں بیٹھا ہوں۔"

یہ نظارہ میرے لئے نیا نہ تھا۔ تھانے میں اکثر ایسی باتیں دیکھنے میں آتی تھیں۔ مگر آج مجھ سے یہ نظارہ نہ دیکھا گیا۔ ایسے معلوم ہوا کہ میری جونی کی سُریلی آواز میرے کانوں میں گونج پیدا کرتی ہوئی آسمان میں غائب ہو گئی۔ لڑکی کی موت کا رنج و غم کسان کی بجائے مجھے زیادہ ہو گیا۔

انسپکٹر صاحب بیاسی کرسی پہ بیٹھے ہوئے آرام سے سگار پی رہے تھے۔

آج اُن کے ایک رشتہ دار نے اپنی لڑکی کے ساتھ شادی کے لئے مجبور کیا تھا۔ پاس ہی چٹائی پر بیٹھے ہوئے وہ انسپکٹر سے بات چیت کر رہے تھے۔ میں یکدم آندھی کی طرح وہاں جا پہنچا اور اونچی آواز سے کہا۔

"آپ آدمی ہیں یا جانور؟"

یہ کہہ کر میں نے تمام دن کی کمائی کے پانچ روپے انسپکٹر صاحب کے آگے پھینک دئے اور کہا۔

"اگر روپے درکار ہیں۔ تو یہ لیجئے۔ جب فرشتہ موت آپ کو لینے آئے گا۔ تب ساتھ لے جائیں۔ اس بیچارے کسان کو چھٹی دیجئے۔ تاکہ یہ غریب اپنی لڑکی کی لاش کو ٹھکانے تو لگائے"

بہت سے ستائے گئے۔ انسانوں کے آنسوؤں سے سینچ کر انسپکٹر کے ساتھ میری دوستی کی بیل جو خوب پھیلی تھی۔ وہ اس جھونکے نے جڑ سے اکھیڑ کر نامعلوم مقام پر پھینک دی۔

تھوڑی دیر بعد انسپکٹر صاحب کے پاؤں پکڑ کر میں نے اپنی بیوقوفی تسلیم کرتے ہوئے معافی مانگی۔ مگر آخر کار مجھے اس مقام کو چھوڑنا ہی پڑا۔"

پیاس

جب خسرو کی جوانی ڈھل چکی - اور اس کا آخری چاہنے والا بھی اسے رات کو سوتا چھوڑ کر رخصت ہو گیا - تو پھر اس کی آنکھیں کھلیں - اس وقت اس نے محسوس کیا - کہ بیس سال گناہ کی زندگی بسر کرنے کے بعد اس کے پاس زہر کھانے تک کو کوڑی نہیں - ہائے افسوس! اُن لوگوں میں جو اس پر جان نثار کرنے کو تیار رہا کرتے تھے - اب ایک بھی ایسا نہ تھا - جو باقی زندگی کی ضرورتیں پوری کرتا - صد حیف ساری عمر گنوا کر ایک پیسہ کا جھونپڑا بھی تک ایسا نہ تھا - جسے وہ اپنا کہہ سکتی - اور جس میں

زندگی یا موت کے دن پورے کرتی۔ وہ دیکھتی تھی کہ جاننے والوں کی طرح اسباب ہستی بھی اس سے بے رحمانہ سلوک کر رہے تھے۔ اور اس افلاس کی تنگی کے باوجود زندگی کے محصولات بدستور تھے۔ اب جو اس نے آمدنی کے قلت اور خرچ کی کثرت پر غور کیا۔ تو ہجوم یاس نے بھیانک صورت اختیار کر کے خوف زدہ کر دیا۔ اور وہ اینٹوں کے سخت فرش پر اوندھی گر کر زار زار رونے لگی۔

شام ہو گئی۔ اور ہر طرف تاریکی پھیلنے لگی۔ لیکن کھرودا میں اتنی ہمت نہ تھی۔ کہ اٹھ کر کمرہ میں جھاڑو لگاتی یا چراغ جلاتی۔ اس کا بھوکا بچہ دن بھر روتا رہا اتنا رویا۔ کہ گھگی بندھ گئی۔ اور آخر تھک ہار کر چارپائی کے نیچے پڑا پڑا سو گیا۔ اتنے میں باہر کے دروازہ پر کسی نے دستک دی۔ اور آواز آئی "کھرودا، کھرودا"

کھرودا غصہ سے جلی بھنی بیٹھی تھی۔ جھاڑو ہاتھ میں لیکر دروازہ کھولنے گئی۔ اس کی قہر آلود صورت دیکھ کر وہ نوجوان جو کھرودا سے عشق کرنے آیا تھا۔ سر پر پاؤں رکھ کر بھاگا۔ بدنصیب عورت نے غصہ کے جوش میں سوتے ہوئے بچہ کو گود میں لیا۔ اور پاس ہی ایک کنوئیں میں کود پڑی۔"

آواز سُن کر ہمسایہ کے لوگ جمع ہوئے اور ماں بچہ کو باہر نکالا۔ گھردا بے ہوش تھی۔ مگر بچہ مر چکا تھا۔ ماں کو ہسپتال میں پہنچایا گیا۔ جہاں بالآخر اسے ہوش آگیا صاحب مجسٹریٹ نے تحقیقات کرنے کے بعد اس کو سیشن سپرد کر دیا۔

(۷)

صاحب سیشن جج کا نام موہن دت تھا۔ انہوں نے مقدمہ کی سماعت کے بعد گھردا کو پھانسی کا حکم سنایا۔ وکیلوں نے سزا میں تخفیف کی بہت کوشش کی۔ مگر پوشیدہ بات یہ تھی۔ کہ جج صاحب کمزور اخلاق کی عورتوں پر خاص طور سے سختی کرتے تھے۔ کیوں؟ اس کی وجہ معلوم کرنے کے لئے اُن کی زندگی کے بعض ابتدائی حالات پر غور کرنا ضروری ہے۔

موہن بابو کالج کی تعلیم کے دنوں میں ایک عمر رسیدہ میاں بی بی کے گھر کے پاس رہا کرتے تھے۔ ان کی ایک جوان بیوہ لڑکی تھی۔ جس کا نام ششی تھا۔ اپنی بیوگی کی تنہائی میں ششی کو جس قدر ظاہری دنیا نظر آتی تھی اُسے ایک ہرا بھرا سنہری زمین کی طرح دکھائی دیتی تھی۔ جس پر

راحت و آرام کا سورج چمکتا ہو۔ رفتہ رفتہ اس کے سینہ میں تمنا و حسرت کا سمندر موجزن ہونے لگا۔ جس کی لہریں اس کے دل کی تیز حرکت کی صورت اختیار کر رہی تھیں۔

جب کبھی ششی کو گھر کے کام کاج سے فرصت ہوتی۔ تو وہ کھڑکی میں بیٹھ کر سڑک پر گذرنے والوں کی طرف دیکھا اور سوچتی تھی۔ کہ یہ لوگ کتنے خوش نصیب ہیں۔ زندگی کے ناٹک میں آوارہ گرد تماشائی اس کو سب سے زیادہ خورم و مسرور نظر آتے تھے۔ اس گروہ میں جوش جوانی میں مخمور نوجوان موہن صبح شام کالج کو جاتے آتے سامنے سے گذرا کرتا۔ شباب کے دن تھے۔ اور کالج کی آزادی ہر وقت بناؤ چناؤ کی فکر رہتی تھی۔ ششی کی نظر اس پر خاص طور سے پڑتی تھی۔ اس کی نظروں میں وہ ایک ہستی خاص کا درجہ رکھتا تھا۔ جس کی ذات کو باقی رہروں کے ہجوم پر غیر معمولی فوقیت حاصل تھی۔

ممکن ہے۔ وہ تخیل کی سرزمین میں رہ کر اپنے بہادر کے خیالی خوشیاں مناتے ہوئے اسی طرح عمر گذار دیتی۔ مگر اس گھڑی کا برا ہو جس میں موہن اس کی طرف دیکھ کر مسکرایا۔ اس تبسم میں نہ معلوم کون سی بجلی ملی تھی۔ کہ اس کی روشنی میں ششی کو وہ سرزمین خیالی بالکل قریب اور

سہل الحصول دکھائی دینے لگی۔ یہ بیان کرنا لاحاصل ہے کہ موہبت کی للچائی ہوئی نظریں اول مرتبہ کب اس پہ پڑیں۔ اور کب سے اس نے نبود کا فرضی نام اختیار کرکے اس سے خط وکتابت کا سلسلہ جاری کیا۔ مختصر یہ کہ اس راحت موہوم نے شمشی کی نظروں میں دنیا اندھیر کردی۔ ایک آندھی تھی۔ جو اس کی پیش بینی کو جڑ سے اکھاڑ کرلے گئی۔ اور اس کے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے غلط املا میں لکھا ہوا جواب نبود کے نام بھیجدیا۔

اس کے چند دن بعد اندھیری رات میں شمشی اپنے والدین کے گھر سے نکلی۔ سڑک پر ایک بند گاڑی کھڑی تھی۔ وہ اس میں داخل ہوگئی۔ کیا یہ بتانے کی حاجت ہے۔ کہ اس گاڑی کو اس جگہ لانے والا نبود عرف موہبت تھا؟

مگر جب اس کا خیالی بہادر اپنی فرضی نمود نمائش کے ساتھ اس کے پیچھے گاڑی میں سوار ہوا۔ اور کھڑکی بند کرکے اس کے پاس بیٹھ گیا۔ تو بیچارا تاب کی ایک فوری تیز لہر نے شمشی کے ایک ایک روئیں میں کپکپی پیدا کردی۔ اتنے میں گاڑی چلنے لگی تھی۔ وہ فوراً اٹھ کر نبود کے قدموں پہ گر پڑی اور رو رو کر کہنے لگی۔

"پرماتما کے لئے مجھے اُتر جانے دو"
مگر اتنے ہی میں تیر کمان سے نکل چکا تھا"

(۱۴)

اب موہن دت کے چلن میں اصلاح عظیم ہو چکی تھی وہ شب و روز مقدس کتابیں پڑھتا اور ریاضت کیا کرتا تھا۔ دُنیا اس کے کارناموں کو فراموش کر چکی تھی۔ مگر ایک جان زندہ تھی۔ جو اب تک اس کی کمزوریوں سے واقف تھی۔

کھروداکا مقدمہ فیصل ہونے کے چند دن بعد کا ذکر ہے۔ کہ موہن بابو کچھ پھل اور سبزی لانے جیل خانہ کے باغ میں گئے۔ وہاں دو آدمی ایک دوسرے سے جھگڑ رہے تھے۔ جج صاحب اندر گئے۔ تو معلوم ہوا۔ کھرودا ایک سپاہی سے جھگڑا کر رہی ہے۔ موہن بابو کے چہرہ پر فاضلانہ تبسم پیدا ہوا۔ دل میں کہنے لگے "یہ ان عورتوں کی حالت ہے موت سامنے کھڑی ہے۔ مگر تکرار سے باز نہیں رہ سکتی۔ شاید دوزخ میں داخل ہوتے وقت وہاں بھی دربانوں سے لڑے گی"

قریب پہنچے۔ تو کھرودا نے ہاتھ جوڑ کر کہا۔ "جج

بابو مہربانی سے میری انگوٹھی واپس دے دو۔"
معلوم ہوا کھُردا نے ایک انگوٹھی اپنے بالوں میں چھپا رکھی تھی۔ جو سپاہی نے اس سے چھین لی۔

موہن بابو حیرت زدہ ہو گئے۔ خیال آیا۔ پھانسی کے تختہ کے پاس کھڑے ہو کر کس نکمی چیز کے لئے جھگڑا ہو رہا ہے سچ اے عورت تیرا نام کمزوری ہے۔ پھر سپاہی سے مخاطب ہو کر وہ بولے۔

"دیکھوں تو انگوٹھی کیسی ہے؟"

مگر انگوٹھی کو ہاتھ میں لیتے ہی موہن بابو اس طرح بھڑکے جیسے کسی نے جلتا ہوا کوئلہ انکے ہاتھ پر رکھ دیا ہو۔ انگوٹھی کے نگینہ میں ہاتھی دانت پر بنی ہوئی ایک بے ریش نوجوان کی چھوٹی سی تصویر تھی۔ اور اس کے اندر "موہن" کا نام کندہ تھا۔ انہوں نے انگوٹھی سے نظر ہٹا کر پہلی مرتبہ کھُردا کے چہرہ کو غور سے دیکھا تو اسوقت پھر انہیں چھبیس سال پہلے کا وہی آنسوؤں سے تر معصوم چہرہ دکھائی دیا جو اس رات اس کے قدموں پر پڑا تھا مگر آہ۔ اب اس میں کیتنا انقلابِ عظیم واقع ہو چکا تھا۔"

رماکانت پریس، سرینگر میں باہتمام رام ناتھ پرنٹر چھپا۔